ایران میں چند روز

از

سعید احمد اکبر آبادی

شیخ محمد بن الحسن بن علی بن الحسن الطوسی (۳۸۵ — ۴۶۰ھ) جو عام طور پر شیخ الطائفہ کے لقب سے مشہور ہیں شیعہ امامیہ مذہب کے بہت بڑے مفسر، محدث، فقیہ اور پانچویں صدی میں اس مسلک کے امام اور مجدد تھے۔ ان کی تصنیفات کم و بیش تمام ہی علوم اسلامیہ پر ہیں اور پھر کتابیں بھی کیسی؟ ایک سے ایک بڑھ کر، علوم و معارف کا گنجینہ۔ چار کتابیں شیعہ مذہب کی اساس سمجھی جاتی ہیں۔ ان میں سے دو کتابیں شیخ طوسی کی ہیں۔ ایران کی مشہد یونیورسٹی نے اپنے ہاں کے شعبۂ اسلامیات کے ماتحت گذشتہ مارچ ۱۹۷۵ء میں نہایت تزک و احتشام کے ساتھ شیخ موصوف کا جشن ہزار سالہ منایا۔ جس میں عالم اسلام کے مختلف نمائندوں کے علاوہ امریکہ، کینیڈا اور یورپ کے نامور مستشرقین شریک ہوئے۔ ہندوستان کی طرف سے راقم الحروف اور ڈاکٹر محمد اقبال انصاری ریڈر شعبۂ اسلامیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے نے شرکت کی مقالات پڑھے اور مذاکرات میں حصہ لیا۔

جشن ۱۹ مارچ ۱۹۷۵ء سے شروع تھا۔ لیکن مشہد یونیورسٹی کے انتظامات کے ماتحت ہمیں ۱۵ کو طہران پہونچنا تھا۔ اس لئے ہم دونوں ۱۴ کی شام کو دہلی پہونچے اور دوسرے دن علی الصباح پان امریکن کمپنی کے بوئنگ طیارہ کے ذریعہ پالم سے پرواز کر کے تین گھنٹہ چالیس

منٹ میں طہران پہونچ گئے۔ اس وقت ہندوستانی وقت کے حساب سے دس بجکر بیس منٹ ہوئے تھے۔ لیکن ایران کا وقت دو گھنٹہ پیچھے ہوتا ہے۔ یہاں مشہد یونیورسٹی کی طرف سے ہمارے استقبال کے لئے کرنل ابو القاسم صدری اور طہران یونیورسٹی کے ایک پروفیسر جن کا نام یاد نہیں رہا، موجود تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ علی گڈھ سے جب ہم لوگ روانہ ہوئے تھے تو اس وقت بارش ہو رہی تھی اور آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ دلی پہونچے تو وہاں بھی بعینہ یہی کیفیت تھی اور اب طہران پہونچے تو یہاں بھی وہی موسم تھا، ابر محیط تھا اور بارش ہو رہی تھی۔ بہرحال کسٹم وغیرہ کی رسومات سے فارغ ہوکر کرنل صدری کی کار میں ہم لوگ روانہ ہوئے اور خیابان ثریا میں مارلیک نام کا ایک اچھا خاصہ ہوٹل ہے اس میں قیام کیا۔ اس ہوٹل کو ارباب علم و دانش سے ایک خاص نسبت ہے۔ شام کے وقت یہ پروفیسروں اور ارباب علم و تحقیق کا غیر رسمی کلب سا بن جاتا ہے۔ چونکہ بارش مسلسل ہو رہی تھی اس لئے کہیں جانے کا تو موقع تھا نہیں، ہم دونوں نے ہلکا سا ناشتہ کیا، غسل کرکے کپڑے بدلے، لنچ کھاکے کچھ دیر قیلولہ کیا۔ عصر کی نماز کے بعد بارش رک گئی تھی اس لئے باہر جانے کا ارادہ کیا۔

مونٹریال (کینیڈا) میں مکگل یونیورسٹی کے ماتحت علوم اسلامیہ کا جو انسٹیٹیوٹ قائم ہے اب اس کی ایک شاخ جس کا کام درس و تدریس نہیں بلکہ محض تحقیق اور تصنیف و تالیف ہے، طہران میں بھی کھول دی گئی ہے۔ اس انسٹیٹیوٹ سے تعلق رہ چکا تھا اور یہاں اس وقت اپنے بعض پرانے ساتھی موجود بھی تھے اس بنا پر خیال کیا کہ وہیں چلنا چاہئے۔ چنانچہ میں اور اقبال صاحب ہم دونوں کرنل صدری کی کار میں روانہ ہوئے۔ مسافت تو ایسی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ لیکن تمام چوڑی چوڑی سڑکیں اور شاہ راہیں عالیشان اور ٹپ ٹاپ کاروں سے بھری پڑی تھیں اس لئے ٹریفک کے اصول و ضوابط کے تحت پہونچتے پہونچتے کم و بیش چالیس منٹ لگ گئے۔ عمارت کے اندر داخل ہوئے تھے کہ اپنے پرانے ساتھی اور رفیق کار پروفیسر ٹی۔ ازلٹسو (T. Izutsu) نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ استقبال اور معانقہ کیا۔ موصوف کا کسی

تو مفصل تعارف میں اپنے مضمون "دیارِ غرب کے مشاہدات وتاثرات" میں کرا چکا ہوں۔ اس موقع پر اس قدر کہدینا کافی ہوگا کہ وہ اسلامیات پر تحقیق ومطالعہ اور اس کے درس وتدریس میں بڑے خلوص اور انہماک سے برابر لگے ہوئے ہیں اور اب تک حسب ذیل کتابیں جو میری نظر سے گذر چکی ہیں بڑے اہتمام سے شائع کر چکے ہیں:

(1) THE STRUCTURE OF THE ETHICAL TERMS IN THE KORAN : بڑی تقطیع ۲۷۵ صفحات

(2) THE CONCEPT OF BELIEF IN ISLAMIC THEOLOGY : A Servantic Analysis of Iman and Islam : تقطیع کلاں صفحات ۲۵۰

(3) GOD AND MAN IN THE KORAN : صفحات ۲۵۰

(4) A Comparative Study of the Key Philosophical Concepts in Sufism and Taoism. : صفحات ۲۱۵

پہلے یہ مکگل یونیورسٹی کے ماتحت انسٹیٹیوٹ میں سال میں چھ ماہ کے لئے وزٹنگ پروفیسر ہوکر آتے تھے اب وہاں مستقل پروفیسر ہوگئے ہیں اور اسی تعلق سے آج کل انسٹیٹیوٹ کی شاخ طہران کے انچارج ہیں۔ یہاں ان کے رفیق کار ڈاکٹر مہدی محقق ہیں جو طہران یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور ساتھ ہی انسٹیٹیوٹ کے ریسرچ مددگار بھی۔

اب سات برس کے بعد ملاقات ہوئی تو اس طرح کہ گویا کبھی جدا ہوئے ہی نہیں تھے۔ ڈاکٹر مہدی محقق بھی اس وقت یہاں موجود تھے۔ ان سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ لیکن وہ بھی برسوں کے بے تکلف دوست معلوم ہوتے تھے۔ ایک دو صاحب اور تھے، کم وبیش ایک گھنٹہ تک کچھ گپ شپ اور کچھ علمی مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ اسی اثنا میں ایک ضخیم مجلد کتاب جو ابھی حال میں

اس انسٹیٹیوٹ کی طرف سے شائع ہوئی ہے اس کا ایک ایک نسخہ ہم دونوں کو تحفۃً پیش کیا گیا۔ اس کتاب کا نام "شرح غرر الفرائد معروف بہ شرح منظومۂ حکمت" ہے۔ اس کے مصنف گذشتہ صدی ہجری کے نہایت بلند پایہ عالم اور فلسفی حاجی ملّا ہادی سبزواری (۱۷۹۸۔ ۱۸۷۸ء) ہیں۔ ملّا صاحب صاحبِ تصانیف کثیرہ تھے۔ مذکورۂ بالا کتاب جو نظم میں ہے سات مقاصد پر مشتمل ہے جن میں امورِ عامہ، الٰہیات اور طبعیات اور اخلاقیات ان سب پر نہایت حکیمانہ اور فلسفیانہ کلام کیا گیا ہے۔ چونکہ کلام بڑا دقیق اور غامض تھا اس بنا پر ملّا صاحب نے خود اس کی شرح لکھی ہے اور ان کے علاوہ دو اور بزرگوں سبزواری اور آملی نے بھی اس کی شروح لکھی ہیں۔ یہ کتاب متعدد بار طہران سے شائع ہو چکی ہے اور ڈاکٹر اقبال نے اپنی کتاب "فلسفۂ عجم" اور فلاسفۂ یورپ نے اس سے استفادہ کیا ہے۔ اب پروفیسر ازٹسو اور ڈاکٹر مہدی محقق دونوں نے مختلف مخطوطوں کی مدد سے کتاب کا یہ نیا اڈیشن بڑی محنت اور جانفشانی سے مرتب کیا اور اپنی تحقیق و ترتیب، تعلیقات و حواشی مختلف قسم کی فہرستوں اور انگریزی و فارسی میں طویل مقدمہ کے ساتھ بڑے اہتمام و انتظام سے شائع کیا ہے۔ مکگل یونیورسٹی کے اسلامک انسٹیٹیوٹ کی طہران میں جو یہ شاخ قائم ہوئی ہے تو اس کی اصل غرض و غایت ہی یہ بیان کی گئی ہے کہ ایران میں اسلامی حکمت و فلسفہ پر خصوصاً اور دوسرے علوم پر عموماً جو بلند پایہ کتابیں لکھی گئی ہیں اور جو اب تک منظرِ عام پر نہیں آسکی ہیں ان کو جدید مغربی اصول و ضوابط کے مطابق اڈٹ کر کے شائع کرنا اور عالم اسلام اور یورپ کو ان سے باخبر کرنا!! آج جبکہ مغربی فلسفۂ و افکار نے عام انسانی ذہن و دماغ پر اپنا تسلط جما لیا ہے اسلامی و مشرقی فلسفہ پر ان کتابوں کی کیا اہمیت ہے؟ اس سوال کا جواب خود پروفیسر ازٹسو کی زبان سے سنئے۔ اس کتاب کے مقدمہ میں مغربی فلسفہ پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مجکو اس بات کا پورا یقین ہے کہ اب وہ وقت آگیا ہے جب کہ حکمت مشرق کے علمبرداروں کو عالمی فلسفہ کے نشوونما اور اس کے ارتقا میں پوری قوت اور وضاحت

سے اپنا رول ادا کرنا ہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ یہ لوگ فلسفہ و حکمت کے اپنے اس خزانہ کا جائزہ لیں جو ان کو ماضی سے ورثہ میں ملا ہے اور پھر اس کو اسی طرح اور اسی زبان میں پیش کریں کہ وہ آج کل کے ارباب دانش کے لئے قابل فہم ہو۔"

انسٹی ٹیوٹ سے واپسی میں دیر کافی ہو گئی تھی۔ اس لئے ہوٹل پہونچتے ہی ہم دونوں سیدھے ڈائننگ ہال میں گھس گئے اور کھانا کھانے لگے۔ ابھی فارغ ہوئے بھی نہیں تھے کہ عزیزہ مہین دخت معتمدی اپنے ایک بھائی کے ساتھ پہونچ گئیں۔ یہ ایران کی بڑی اچھی شاعرہ اور ادیبہ ہیں۔ حافظ کے رنگ میں کہتی ہیں۔ ان کا کلام وہاں کے مجلات و رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ ایک اسکول میں پڑھاتی ہیں اور ساتھ ہی طہران یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کر رہی ہیں۔ ان سے میری پہلی ملاقات اور تعارف اس طرح ہوا کہ ۱۹۶۴ء میں وہ ایران کے طلبا اور طالبات اور اساتذہ کی ایک ٹیم کے ساتھ علی گڑھ آئی تھیں۔ یہاں وائس چانسلر بدر الدین طیب جی نے ان سب کو لنچ پر مدعو کیا۔ میں بھی موجود تھا اور معتمدی میرے قریب بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہندوستان میں فارسی شعر و شاعری کا ذکر چھڑ گیا تو میں نے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے فیضی، غالب، شبلی اور اقبال کے بعض بہترین اشعار سنا کر کہا کہ یہ وہ اشعار ہیں جو دنیا کی کسی بھی زبان و ادب کے لئے ہمیشہ باعث فخر ہو سکتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے اہل ایران ان شعرا کو سبک ہندی کہکر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور انھیں کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ معتمدی اس گفتگو سے کافی متاثر ہوئیں اور رخصت ہوتے وقت مجھ سے وعدہ لیا کہ وہ ایران واپس پہونچکر مجھکو خط لکھیں گی تو میں اس کا جواب دوں گا۔ چنانچہ وہ دن ہے اور آج کا دن کہ ان سے برابر مراسلت جاری اور عزیزانہ تعلق قائم ہے۔

میں نے ہندوستان سے روانگی سے پہلے ان کو مطلع کر دیا تھا کہ فلاں تاریخ کو طہران پہونچ رہا ہوں۔ لیکن یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ وہاں قیام کس ہوٹل میں ہوگا۔ لیکن انھوں نے ادھر اُدھر ٹیلیفون کر کے آخر پتہ چلا ہی لیا اور ہوٹل پہونچ گئیں۔ ایران کی تہذیب اور قاعدہ کے مطابق

ایک گلدستہ بھی لائی تھیں۔ لیکن یہ گلدستہ ہمارے ملک جیسا نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک بڑی سی ٹوکری جس کے اندر ٹین منڈھا ہوا اور اس میں پانی ہوتا ہے اس میں رنگ برنگ کے پھول مع اپنی شاخوں کے بڑے سلیقے سے سجے ہوتے ہیں۔ اب ہم لوگ ڈائننگ ہال سے اٹھکر اپنے کمرہ میں آبیٹھے۔ ایران کے لوگ، مرد ہوں یا عورت، بڑے خوش طبع اور شگفتہ مزاج ہوتے ہیں۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ ہم لوگ ہنستے بولتے اور ایران و ہند کے مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے اجازت چاہی تو تاج محل کا ایک موڈل جو میں تحفۃً لایا تھا ان کے حوالہ کیا اور ہم دونوں عشا کی نماز ادا کر کے سو گئے۔

دوسرے دن ناشتہ کے فوراً بعد مشہد کے لئے روانہ ہونا تھا۔ صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ شب میں بیروت سے عالم اسلام کے بلند پایہ محقق ڈاکٹر صلاح الدین المنجد، کنیڈا سے ڈاکٹر چارلس آدم، امریکہ سے ڈاکٹر جارج عطیہ، اور پروفیسر واٹ منٹگمری وغیرہم آگئے ہیں۔ انڈونیشیا کے مندوب پہلے پہونچے ہوئے تھے۔ ہم سات ساڑھے سات بجے کے قریب ناشتہ کے لئے ڈائننگ ہال میں پہونچے تو وہاں ان سب حضرات سے ملاقات ہوئی۔ مراکو کی استقلال پارٹی کے مشہور لیڈر اور مصنف و ادیب الاستاذ علال الفاسی بھی مع اپنے ساتھیوں کے پہونچ چکے تھے اور سیاسی لیڈر ہونے کے باعث ان کی آمد کی خبر فوٹو کے ساتھ ایران کے اخبارات میں چھپی تھی۔ لیکن ان کا قیام کسی اور ہوٹل میں تھا۔ ناشتہ سے فراغت کے کچھ دیر بعد ہم سب طیران گاہ طہران کے لئے روانہ ہوئے۔ وہاں پہونچنے پر خاص طہران سے جو حضرات جشن ہزار سالہ میں شرکت کے لئے مشہد جارہے تھے ان سے بھی ملاقات ہوئی اور ہمارا قافلہ خاصہ بڑا ہو گیا۔ گیارہ بجکر بیس منٹ پر ہوا پیمائے ملی ایران کا جہاز اڑا اور ایک گھنٹہ کے بعد ہم لوگ مشہد پہونچ گئے۔ یہاں مشہد یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر عبداللہ فریاد، استاذ محمد واعظ زادہ خراسانی سکریٹری طوسی جشن ہزار سالہ اور یونیورسٹی کے دوسرے اساتذہ و علما استقبال کے لئے موجود تھے۔ ان کے ساتھ ایران ہوٹل آئے جو غالباً مشہد کا سب سے بڑا ہوٹل ہے اور اپنے اپنے کمروں میں

مقیم ہو گئے۔ میرا اور اقبال صاحب کا ایک کمرہ ہے۔ ایک کار اور ایک گائڈ ہم دونوں کے لئے وقف ہیں کہ جب اور جس جگہ چاہیں جائیں اور آئیں۔

یوں تو سرزمین ایران کو تاریخ اسلام میں سیاسی، مذہبی، علمی، ادبی اور فنی اعتبار سے ہمیشہ غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے اور اس بنا پر اس کے چپہ چپہ پر اسلامی آثار و مآثر بکھرے پڑے ہیں لیکن موجودہ زمانہ میں جو اہمیت مشہد کی ہے وہ ایران کے کسی اور شہر کی نہیں۔ یہ شہر جو ایران کے شمال مشرقی حصہ میں واقع اور سطح سمندر سے تین ہزار دو سو فٹ بلند ہے خراسان کے صوبہ کا دارالحکومت ہے۔ بلکہ ایک زمانہ میں تو پورے ملک کا دارالسلطنت بھی تھا۔ یہاں کی آب و ہوا ایسی معتدل اور خوشگوار ہے کہ گرمیوں میں لوگ عام طور پر تبدیل آب و ہوا اور شدت گرما سے بچنے کے لئے یہاں آتے ہیں۔ موجودہ شہر ایک بالکل ماڈرن اور عہد جدید کا تعمیر شدہ ہے۔ اسلامی تاریخوں میں طوس جس شہر کا نام آتا ہے وہ دراصل یہی تھا اور اب بھی موجودہ شہر کے دو محلے نوغان اور سناباد اسی قدیم شہر کی یادگار ہیں۔ تیموری سلطنت کے زمانہ میں جب طوس برباد ہو گیا اور اس کے بعد شہر کو از سر نو آباد کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تو شہر کے ایک ٹکڑہ کو طوس کے نام سے الگ کر دیا گیا جو اب بھی موجود ہے اور باقی شہر کو مشہد کے نام سے از سر نو بسایا گیا۔ اس نام کی وجہ یہ ہے کہ شیعہ حضرات کے آٹھویں امام حضرت علی بن موسیٰ رضاؑ نے اسی شہر میں زہر کھا کے جام شہادت نوش کیا تھا اور یہیں دفن ہوئے تھے۔ اس مقبرہ کی وجہ سے شہر میں تقدس کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ دنیا کے مختلف گوشوں سے مرد اور عورت حاجی اور زائر یہاں برابر آتے رہتے اور برکت حاصل کرتے ہیں۔ طہران سے اس شہر تک ۹۰۹ کیلو میٹر کا فاصلہ ہے۔ ہوائی جہاز کے علاوہ ریل اور بسیں جو ماڈرن اور بڑی آرام دہ ہیں ان کی بھی آمد و رفت رہتی ہے۔

شام کو عصر کے بعد جب ہم نے باہر جانے کا ارادہ کیا تو ظاہر ہے سب سے مقدم روضۂ امام رضا پر حاضری ہی ہو سکتی تھی اور پھر یہ جگہ تھی بھی ہمارے ہوٹل سے بہت قریب۔ اس لئے ہم

گائڈ کو ساتھ لے کر پاپیادہ ہی نکل گئے۔ اس پوری عمارت کو یہاں حرم بھی بولتے ہیں اور آستان قدس بھی۔ یہ ایک نہیں بلکہ بہت سی عمارتوں کا مجموعہ ہے اور اس کا اڈمنسٹریشن بھی سب سے الگ ہے۔ یہاں تک کہ روضہ سے متعلق جو کاریں ہیں ان کی پلیٹوں پر بھی مشہد کے بجائے "آستان قدس" لکھا ہوا ہے۔ چونکہ آج مارچ کی ۱۶ اور محرم الحرام کی ۸ تھی اس لئے آستان قدس کی تمام عمارتیں مردوں اور عورتوں سے پٹی پڑی تھیں۔ ان میں کوئی نماز پڑھ رہا تھا کوئی درود وسلام، کوئی قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول تھا اور کوئی سلام ومنقبت میں۔ کتنے تھے جو آہ وبکا اور گریہ وزاری کر رہے تھے۔

دامنوں کی نہ خبر ہے نہ گریبانوں کی
قابل دید ہے دنیا ترے حیرانوں کی

بہرحال بڑی دقت اور دشواری سے اندر داخل ہو کر ہٹتے بچتے خاص مزار پر حاضر ہو کر فاتحہ پڑھی اور واپس ہو گئے۔ یہاں بہت سی چیزیں دیکھنے کی تھیں۔ لیکن اس وقت موقع نہیں تھا۔ ایران میں ماہ محرم الحرام کی تقریبات اور ماتم عشرۂ محرم یعنی ۱۰ تاریخ پر ختم ہو جاتی ہیں اور زندگی کا سارا کاروبار نارمل ہو جاتا ہے اس لئے خیال کیا کہ آج ۸ ہے اب دو دن تو رہ ہی گئے ہیں۔ اس کے بعد مفصل طور پر دیکھیں گے۔

مغرب کے بعد ہوٹل واپس آئے تو معلوم ہوا کہ ہم سب مندوبین کو رات کا کھانا مشہد یونیورسٹی میں کھانا ہے۔ چنانچہ ½ ۸ بجے کے قریب کاریں آگئیں اور ہم روانہ ہوئے۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ اور سردی ایسی تھی جیسی کہ ہمارے ہاں نومبر کے شروع یا فروری کے آخر میں ہوتی ہے۔ سب گرم کپڑوں میں ملبوس تھے۔ اسٹاف کلب پہونچے تو یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے اساتذہ اور عمائد یونیورسٹی کے ساتھ استقبال کیا۔ اسٹاف کلب کی عمارت بہت وسیع اور بڑی شاندار ہے۔ پوری عمارت سنگ مرمر کی ہے۔ نہایت کشادہ ہال، صوفوں اور کرسیوں سے مزین، قالین بچھے ہوئے، پردے لٹکے

ہوئے۔ اس میں جاکر بیٹھ گئے۔ اس یونیورسٹی کا موٹو (Motto) یہ آیت ہے: "یَرْفَعُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا مِنْکُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ" جو مرکز میں کندہ تھی۔ ڈنر میں تکلفات کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ دستر خوان پر جو تکلفات اور وہ بھی نہایت فراخدلی اور عالی حوصلگی کے ساتھ مسلمان اقوام میں پائے جاتے ہیں کسی اور کے ہاں نہیں پائے جاتے یہاں ایران کے متعدد نامور محققین و مصنفین سے جن کے نام آگے آئیں گے ملاقات اور گفتگو ہوئی۔ یہاں ایک دلچسپ اور قابل ذکر بات یہ ہوئی کہ وائس چانسلر صاحب ـــــ جیسا کہ آج کل ہر جگہ ہو رہا ہے ـــ یونیورسٹیوں میں طلبا کی بے راہ روی اور سرکشی کی شکایت کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا: "آپ کے نزدیک اس کے اسباب کیا ہیں"؟ انھوں نے کہا: "بڑی وجہ طلبا کی مذہبیت ہے۔" یہ بڑی عجیب سی بات تھی۔ اس لئے میں نے کہا: "یہ آخر کس طرح"؟ انھوں نے جواب دیا کہ "طلبا علوم جدیدہ کی کتابیں پڑھتے ہیں اور ان میں بہت سی باتیں ان کو اپنے مذہبی عقائد و مزعومات کے خلاف نظر آتی ہیں تو ان کے ذہن میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے اور جب یہ انتشار ذہنی شدید ہوتا اور اجتماعی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اس سے عمل بغاوت و سرکشی کا ظہور ہوتا ہے۔"

دوسرے دن مارچ کی ۱۷ اور محرم الحرام کی ۹ تاریخ تھی۔ اس تاریخ کو مغرب کے بعد گورنر کی طرف سے آستان قدس میں مجلس عزا کا خاص اہتمام و انتظام ہوتا ہے۔ ہم لوگ بھی اس میں باضابطہ طور پر مدعو تھے۔ سات بجے ہم لوگ وہاں پہونچ گئے اور ایک ہال میں جو افسرانِ حکومت اور مدعوئین کے لئے مخصوص تھا بٹھا دئے گئے۔ نشست کا انتظام کرسیوں پر تھا۔ پہلے ہم لوگوں کی خاطر تواضع چائے سے ہوئی۔ چائے کے ساتھ حاضرین مجلس سگرٹ نوشی بھی کرتے رہے ۷½ بجے کے قریب ایک مولانا آئے اور انھوں نے قرآن مجید کی آیت: اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ الآیۃ پڑھکر بیان شروع کر دیا۔ ایرانیوں کے مخصوص لب و لہجہ کے باعث تقریر کچھ سمجھ میں آئی اور کچھ نہ آئی۔ بیان نصف گھنٹہ میں ختم ہوگیا۔ اور مولانا تشریف لے گئے لیکن ہم سب بیٹھے رہے۔ اتنے میں ملازمین آستان قدس تھالوں میں موم بتیاں لئے ہوئے اندر آئے

اور ہم کو ایک ایک موم بتی تقسیم کردی گئی۔ اس کے بعد ایک موم بتی جلائی گئی اور اس ایک سے ہم سب نے باری باری اپنی موم بتیاں روشن کرلیں۔ جب یہ سب کچھ ہوگیا تو اب ہم لوگ اپنے اپنے ہاتھ میں روشن شمع لئے ہوئے ایک جلوس کی شکل میں ہال سے روانہ ہوئے اور متعدد کمروں سے گذرتے ہوئے روضۂ مبارک کے سامنے ایک نہایت وسیع صحن میں صف بستہ کھڑے ہوگئے۔ یہاں ہم مہمانان و مدعوین خصوصی کے علاوہ عام مردوں وعورتوں کا بھی عظیم مجمع تھا لیکن ان لوگوں کے ہاتھوں میں شمعیں نہیں تھیں۔ اب اوپر کی منزل سے لاؤڈ سپیکر پر نظم خوانی شروع ہوئی۔ پورا مجمع خاموشی کے ساتھ کھڑا سنتا رہا۔ یہاں تک کہ اچانک مجمع میں آہ وفغاں کا شور برپا ہوا۔ تمام شمعیں بجھادی گئیں اور مجمع منتشر ہوگیا۔ ہمارے ساتھیوں میں سب لوگ حیران تھے کہ یہ سب کچھ کیا تھا۔ اور معرکۂ کربلا میں شبستان نشاط کا کیا موقع تھا؟ لیکن اس کی اصل یہ ہے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے وفات کے وقت وصیت کی تھی کہ ان کے صاحبزادہ قاسم کا نکاح حضرت امام حسین کی صاحبزادی فاطمہ صغرا سے کردیا جائے۔ امام عالی مقام نے بھائی کی اس خواہش اور اپنے وعدہ کا لحاظ اور پاس اس درجہ کیا کہ عین اس موقع پر جب کہ اہل بیت کی جانوں پر بنی ہوئی تھی آپ نے صاحبزادی کا نکاح بھتیجہ سے کردیا۔ لیکن صاحبزادی کے ہاتھ کی مہندی ابھی خشک بھی نہیں ہوئی تھی کہ میدان کربلا خون شہادت سے لالہ زار بن گیا۔ ہندوستان میں محرم کے دنوں میں جو مہندیاں اٹھتی ہیں وہ اسی واقعہ کی یادگار ہیں اور ایران میں یہ یادگار اس طرح منائی جاتی ہے۔ (باقی)

حیات ذاکر حسین

صدر جمہوریۂ ہند جناب ذاکر حسین خاں کی خدمت علم اور ایثار و قربانی سے بھرپور زندگی کی کہانی جس پر پروفیسر رشید احمد صدیقی نے پیش لفظ تحریر فرمایا ہے اور کتاب کو قابل رشک وتحسین قرار دیا ہے۔ یہ کتاب متعدد انگریزی، اردو کی کتابوں، ملکی اور غیر ملکی رسائل و اخبارات کی چھان بین کے بعد قلم بند کی گئی ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تاریخ کے اہم دور یعنی ذاکر صاحب کے زمانہ کے حالات و واقعات سے مستند ترین حوالوں اور خود ذاکر صاحب سے متعدد ملاقاتوں کی روشنی میں پہلی بار پردہ اٹھایا گیا ہے۔ مولفہ: خورشید مصطفےٰ رضوی
کتابت طباعت اور کاغذ بہتر۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ عمدہ پارچہ کی جلد۔ قیمت آٹھ روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶